Mairaj
Vol 2, Issue 2
https://www.mairaj.pk editor.mairaj@gmail.com
ISSN Online 2959-2089 ISSN Print 2959-2070

اقصیٰ رخسار
پی ایچ ڈی سکالر لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی
ڈاکٹر شازیہ رزاق
اسسٹنٹ پروفیسر لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی

تعلیمی پسماندگی کے اسباب واثرات اور پاکستانی معاشرہ

Aqsa Rukhsar
Scholar Ph.D Lahore College For Women, University
Dr. Shazia Razzaq
Assistant Professor Lahore College For Women, University

Causes and effects of educational backwardness and Pakistani society

The positive changes that education brings to our thoughts, helps in overcoming the difficulties of life. Various social problems of our society can be eradicated only through education because, the development of society depends upon the awareness of discernment which is possible only through education. An educated rank can lead a better standard of living. Education is the name of awakening of consciousness not only in individuals but also in masses and foster a civilized society. Any society lacking education is not only deemed incomplete but also a dysfunctional one in the world. Societies based on ignorance always fail and lead to anarchy, ill mannered, immoral, and uncivilized lifestyle. Success cannot be imagined without education. Education is the first necessity for socio-economic development of any nation. Education helps in maintaining law and order in the country. A well-educated population tends to uphold the law, while an uneducated one may promote criminal activities like theft, robbery, and murder to fulfill their needs and wants; ultimately disrupting social harmony and leading to; law and order violation in society. Education is the movement from darkness to light; and is the fundamental right of every human being in this world because the development of the world is entirely dependent on education.

Key Words: education, social, eradicated, society, awareness, discernment, standard, consciousness, civilized, ignorance, anarchy, mannered, immoral, uncivilized, socio-economic, nation, law, criminal, social harmony, violation, fundamental right, development

کلیدی الفاظ: تعلیمی شعور، ایسٹ انڈیا کمپنی، برطانوی حکومت، ''اسٹار آف انڈیا، طبقاتی تقسیم

ایک زمانے تک اگرچہ برصغیر میں تعلیمی پسماندگی کے مظاہر میں، معاشرتی سطح پر جہالت، غربت اور ذہنی پسماندگی کا نمایاں حصہ ہے لیکن شہری زندگی کے مقابل دیہی زندگی میں تعلیمی شعور اور اس کی ضرورت کا احساس اجاگر کرنے میں ریاستی اور جاگیردارانہ رویوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان رویوں نے غربت میں پسے ہوئے افراد کے لیے تعلیمی سہولیات دینا تو بہت دُور کی بات ہے، اپنے نواح میں اسکولوں کے قیام کو ہمیشہ اس خدشے سے روکے رکھا کہ اگر عام لوگوں کے بچے تعلیمی شعور حاصل کر گئے تو وہ ہمارے مقابل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان جاگیرداروں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مکمل حمایت حاصل تھی کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان جاگیرداروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی

کا مکمل ساتھ دیا تھا جس کے عوض انھیں بھاری جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو بھی تھوڑی بہت مالی استطاعت رکھتا، وہ انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا تو اسیصلۂ خدمت کے طور پر جاگیر عطا کر دی جاتی۔ اس غلطی کا احساس حکومت کو بعد میں ہوا جب انھیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب جاگیر دار طبقے نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تو برطانوی حکومت نے بھی اس طبقہ کے تحفظ، ترقی اور استحکام کے لیے کافی اقدامات کیے۔ تاہم ملکی حالات چوں کہ تیزی سے بدل رہے تھے۔ شہروں میں ترقی کے ساتھ ساتھ تاجر طبقہ پیدا ہو رہا تھا اور گاؤں میں ساہوکار طاقت پکڑتے جا رہے تھے، جاگیر دار اپنی جاگیروں کا انتظام ٹھیک سے سنبھالنے کے بجائے عیش و عشرت پر دولت خرچ کرتے رہے، یہاں تک کہ مالی حالات کی خرابی کی وجہ سے اندر ہی اندر یہ جاگیر داری نظام کمزور پڑ رہا تھا مگر حکومت چاہتی تھی کہ یہ طبقہ قائم رہے چناں چہ نہ صرف انھیں قانونی تحفظ دیا جا رہا تھا بلکہ تعلیم و تربیت میں بھی حکومت نے ان کے لیے خاص انتظامات کروائے تاکہ تعلیم کے ذریعے بدلتے ہوئے حالات کا تصور ان میں پیدا ہو سکے۔ ان جاگیر داروں کے بچوں کے لیے سکولوں میں خاص قسم کے تربیتی انتظامات کروائے جاتے اور وہ نوکروں کی فوج کے ہمراہ وہاں جاتے۔ ۱۸۸۶ء میں لاہور میں ایچی سن کالج محض جاگیر داروں کے لیے تعمیر کیا گیا اور غریب وہاں تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

برطانوی حکومت نے ان جاگیر داروں کو بڑے بڑے خطابات و اعزازات سے بھی نوازا۔ قدیم خطابات مثلاً راجہ، مہاراجہ، رائے، نواب، خان وغیرہ کے ساتھ انھیں برطانوی خطابات مثلاً ''آنرآف برٹش انڈیا'' ''اسٹار آف انڈیا'' وغیرہ بھی عطا کیے۔ اس کے علاوہ عام عوام سے ان کے رتبے کو بلند کرنے کے لیے دیگر مراعات بھی دیں، مثلاً غدر کے بعد لوگوں سے اسلحہ واپس لے لیا گیا مگر جاگیر داروں کو اس کی اجازت تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جاگیر داروں سے فوجی دستے واپس لے لیے تھے مگر پھر ان کی طاقت قائم رکھنے کے لیے انھیں فوجی دستے بھی عطا کر دیے تاکہ یہ لوگ شان و شوکت سے عام لوگوں پر قابض رہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اس وقت جو معاشی نظام پیدا ہوا اس نے معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ایک حکمران طبقہ اور دوسرا محکوم طبقہ، محکوم دولت پیدا کرتا اور حاکم اس دولت کا غالب حصہ اپنے تصرف میں لے لیتا۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ محکوم کی دلچسپی دولت کی پیدائش کی طرف سے کم ہونے لگی۔ خود حکمران طبقہ دولت کی پیدائش میں اس لیے دلچسپی نہیں لے رہا تھا کہ جو کچھ دولت اس طرح پیدا ہو رہی تھی وہ اس کی اپنی ضروریات کے لیے کافی تھی اس طبقے کے لیے دولت کا مصرف صرف یہ تھا کہ اسے صرف کرے۔ محکوم طبقے کی فلاح و بہبود سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا''۔ ۱

اس طرزِ عمل نے پاکستان میں بھی معاشرے کو محکومیت کے جال میں جکڑ رکھا ہے جس کے نتیجے میں تعلیمی ترقیات کی جانب سنجیدہ بنیادوں پر کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی اور پاکستانی معاشرہ مسلسل ایک محرومی، بے چینی اور مستقل مالی پسماندگی کا شکار ہونے کے باعث تعلیمی پس ماندگی کا بھی شکار ہوتا چلا گیا اور جن مختلف عناصر نے پاکستانی معاشرے کو اس پس ماندگی سے دوچار کیا، ان میں جہاں سیاست کے شعبدہ کاروں نے اپنا کردار ادا کیا وہیں ان کی بے رہروی نے قومی خزانے کو بھی قومی خدمت کے بجائے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جس سے زندگی کے مختلف شعبہ جات میں وسائل کی کمی اپنا بے رحمانہ تسلسل اختیار کرتی رہی۔ نتیجتاً معاشرے میں ناجائز ذرائع پیدا وار بڑھنے لگے اور کاروباری طبقات میں دولت کے ناجائز حصول کو روا سمجھتے ہوئے معاشرے کو اخلاقی تنزل سے بھی دوچار کر دیا اور ان مظاہر میں طبقاتی تقسیم، جنسی مسائل، ازدواجی زندگی کے مسائل، عورتوں پر مردوں کی ناروا اجارہ داری، نفسیاتی مسائل، ذہنی پسماندگی، اخلاق باختگی، تعلیم سے عدم دل چسپی اور تعلیمی پس ماندگی جیسے مظاہر نے جنم لیا۔ مخلوط تعلیم نے معاشرے میں اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا اور جنسی بے رہروی جیسے مسائل نے سر اٹھایا۔

یہ وہ بنیادی پہلو ہیں جو پاکستانی معاشرے میں جہالت کا سبب بنے اور تاحال ان منفی پہلوؤں سے عدم توجہی کے باعث حکومتی ایوانوں میں بھی ان مظاہر کے پروردہ مقتدر طبقوں نے اپنی من مانیوں سے سماجی سطح پر جو نقصانات پہنچائے، ان کا ازالہ نہیں ہو سکا، اور ہوتا بھی کیسے کہ مقتدر طبقے کو صرف اور اقتدار سے غرض رہی اور اپنی حکومتیں بچانے میں ہر وہ کام کیا جو کسی دائرہ اخلاق یا ضابطۂ دانش کا پابند نہیں۔ بالخصوص اشرافیہ اور غیر اشرافیہ کی طبقاتی تقسیم نے بھی سماجی فلاح و بہبود میں سوائے کھوکھلے دعوؤں کے کسی عملی کوشش کو بروے کار نہ آنے دیا بلکہ اشرافیہ نے ہمیشہ اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے مفلوک الحال طبقے کی معاشی، سماجی اور تعلیمی حالت کو پست رکھنے میں مختلف حربوں سے کام لیا جس سے ایک ایسا پاکستانی معاشرہ تشکیل پا گیا جو اقتصادی دوڑ میں حلال و حرام کے امتیاز سے تجاوز کرنے پر مجبور ہو کر رہ گیا۔

طبقاتی تقسیم

جیسا کہ پاکستانی معاشرہ مختلف طبقات میں بٹا ہوا ہے اور یہاں طبقاتی تقسیم روز بہ روز گہری ہوتی جا رہی ہے، یہاں کی اشرافیہ اور مقتدرہ نے چھوٹے طبقات کو اپنے اپنے شکنجوں میں کسا ہوا ہے۔ اب ملک کے اندر واضح طور پر دو طرح کے نظام کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے فیصلے اور احکامات ہر طبقے کے لیے مختلف ہیں۔ امیر طبقے کی رہائشی کالونیاں الگ نظر آتی ہیں جہاں صفائی، سیوریج، سڑکوں اور ٹریفک کا نظام حکومتی ادارے عمدہ طریقے سے چلا رہے ہوتے ہیں جب کہ غریب طبقے کے رہائشی علاقوں کے مسائل

میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہوتا ہے۔ اشرافیہ کے لیے سیکورٹی کے انتظامات عمدہ اور مثالی ہوتے ہیں جب کہ عام طبقہ حالات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے، یوں بنیادی انسانی حقوق مساوی نہیں ہیں۔ پوری مہذب دنیا میں قانون کا اطلاق غریب اور امیر کے لیے یکساں ہے مگر یہاں قانون اور انصاف کے تقاضے بھی ہر طبقے کے لیے الگ الگ ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں طبقات میں بڑھتی ہوئی یہ خلیج ہر طرح کی شکست وریخت کا سبب بنتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر خلیل احمد لکھتے ہیں:

"مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ حکمرانی کے ساتھ اشرافیہ کا براہِ راست تعلق کمزور پڑ گیا ہے۔ اب یہ سیدھی سی نری حکمران نہیں رہی لیکن حکمرانی کے ساتھ اس کا تعلق کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ شکل میں ضرور موجود رہا۔ صاف بات ہے کہ ترقی یافتہ سوسائیٹیوں میں اشرافیہ کو براہِ راست حکمران سے دور ہٹنا پڑا اور یہ کناروں پر چلی گئی مگر پسماندہ اور ترقی پذیر سوسائیٹیوں میں ریاست یا/اور ریاستی وجود میں آنے کے باوجود اشرافیہ کسی نہ کسی شکل میں بلاواسطہ طور پر حکمرانی پر قابض رہی۔ پاکستان اسی چیز کی بہت کھلی مثال ہے۔ یہاں ایک آئینی ریاست ہونے کے باوجود، اشرافیہ ایک طفیلی بیل کی طرح حکمرانی سے لپٹی ہوئی ہے اور شہریوں کا خون چوس رہی ہے۔"۲

یہی اشرافیہ چھوٹے طبقوں کو زبان نہیں دیتی اور ان کی آواز کو دبا دیتی ہے۔ پاکستانی معاشرے کا المیہ ہے کہ یہ بااثر طبقہ معاشرے کا دو فیصد حصہ ہیجو اٹھانوے فی صد کا استحصال کر رہا ہے۔

تعلیم سے عدم دل چسپی اور تعلیمی پس ماندگی

دنیا کے جن معاشروں گھروں میں اسکول جانے کا کوئی تصور نہیں تھا، اور بچے عقل و ہوش سنبھالتے ہی اپنے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑے لے کر محنت و مزدوری کے لیے کھیتوں اور بازاروں میں گھومتے رہتے تھے، اب ان کی پیٹھ پر کتابوں کے بھاری بیگ ہوا کرتے ہیں اور انھوں نے اسکول کی دنیا کو اپنے آپ سے آباد کر رکھا ہے؛ لیکن ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہمارا سفر پیچھے کی طرف ہے، ہم نے ترقی کے بجائے تنزل کو اور محنت کے بجائے تن آسانی و سہل انگاری کو اپنی منزل بنالیا ہے اور اس کے کئی اسباب ہیں۔

پہلا سبب تعلیم کے معاملہ میں ہماری بے شعوری ہے، مسلمانوں میں آج بھی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو تعلیم کی اہمیت سے نابلد ہیں، مسلمانوں میں جو مزدور اور کم معاش طبقہ ہے، وہ ابھی تک اسی فکر کا اسیر ہے کہ اپنے بچوں کو پتھر پھوڑنے، ہوٹلوں کی میز صاف کرنے اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں لگا دیا جائے تاکہ کچھ روپے آجائیں اور گھر چلانے میں آسانی ہو۔ دوسرے تعلیم سے غفلت تاجروں کے طبقہ میں بھی پائی جاتی ہے، بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اگر یہ پڑھ لکھ کر اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر لیں تو اس کو اسی تجارت یا کاروبار میں رہنا ہے، ایسی صورت میں زیادہ تعلیم کی کیا ضرورت ہے؟ اگر بہ قدرِ ضرورت تعلیم کے بعد اسے کاروبار میں لگا دیا جائے تو پیسے بھی بچیں گے اور وقت بھی بچے گا، نیز جتنی مدت اس کے حصولِ تعلیم میں لگتی ہے، اس میں اسے کام کا اچھا خاصا تجربہ ہو جائے گا، اس سوچ اور اس ذریعہ معاش نے بہت سے کھاتے پیتے گھرانوں کو بھی تعلیمی پس ماندگی سے دوچار کر رکھا ہے۔

تعلیمی پسماندگی کا ایک بڑا سبب طلبہ و طالبات کے والدین کا اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف سے بے تعلق اور غافل رہنا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کر دیتے ہیں اور پھر کبھی پلٹ کر اس بات کا جائزہ نہیں لیتے کہ ان کا تعلیمی رجحان کیا ہے؟ وہ پابندی سے اسکول جا بھی رہے ہیں یا نہیں؟ والدین طلبہ و طالبات سے عام طور پر اسکول کے ذمہ داروں کو یہ شکایت ہے کہ اُن کی غفلت کا نو عمر اور مستقبل کے نفع و نقصان سے بے خبر بچے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ کثرت سے غیر حاضر رہتے ہیں، تفویض کیا گیا کام انجام نہیں دیتے، انتظام شکنی کرتے ہیں، اساتذہ اور ذمہ داروں کے ساتھ بد تمیزی کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور والدین کے عدم تعاون کی وجہ سے بچے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ان تمام مظاہر کے دوش بہ دوش غربت زدہ افراد کے بچوں کے لیے تعلیمی اخراجات بھی ایک نمایاں مظہر ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکتے۔ غربت کی چکی میں پسنے والے نوجوان اعلیٰ اور معیاری تعلیم کو اپنی دسترس سے باہر گردانتے ہیں یوں کئی ایک قابل نوجوان اپنے ہنر اور کمالِ مہارت سے قوم کو مستفید کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ تعلیم کسی ایک خاندان یا طبقے کی وراثت نہیں ہے مگر یہ ہمارے نظام کی بد قسمتی ہے کہ آج تعلیم بھی طبقات میں بٹ چکی ہے اور نظام تعلیم بھی تقسیم کا شکار ہے، اعلی تعلیم کے لیے اعلی وسائل درکار ہیں، اور نچلے طبقے کے لیے موجود سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں، نئی نسل اس تقسیم کے بعد قومی یکجہتی کے فلسفے سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ کئی قابل طالب علم بستہ چھوڑ کر چھابڑی لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کئی ایک قابل بچے میٹرک کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ کئی قابل طلبا اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے پہلے ہی کسی مکینک کی دکان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ غریب خاندان تعلیمی اخراجات نہ اٹھانے کی وجہ سے اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں دیکھ پاتے۔ کئی غریب والدین اپنے بچوں کو اعلیٰ منصب پر فائز دیکھنے کی چاہ میں زندگی کے نام پر سزا کاٹتے ہیں، ہمارے معاشرے میں کئی ایسے بوڑھے باپ ہیں جو اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے دن کی مشقت کے بعد رات بھر چوکیداری کرتے ہیں۔

ان عوامل سی معاشرے میں عدم توازن کی فضا پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے کئی ایک اخلاقی جرائم سمیت کئی ایک نفسیاتی پریشانیاں بھی نوجوانوں کو دامن گیر ہو جاتی ہے تمام جرائم مثلاً چوری، ڈکیتی، دوسروں کے حقوق کی پامالی، بدزبانی، خانگی اور معاشرتی لڑائی جھگڑے، حیوانی طرزِ عمل، دہشت گردی، بغض و حسد، عناد، دشمنی، دوسروں پر اپنی سبقت حاصل کرنے کے لیے ناجائز طاقت کا استعمال وغیرہ، یہ سب وہ مسائل ہیں جو معاشرتی پیچیدگیاں پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ معاشرے میں ان جرائم سے بے اطمینانی، جھنجلاہٹ اور عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا ہے، یوں تعلیمی پسماندگی سے پس ماندہ معاشرہ جنم لیتا ہے اور احساسِ ذمہ داری اور قومی شعور سے بے نیاز ہر قسم کے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

مخلوط تعلیم

ایک مدت سے ہمارے یہاں مخلوط تعلیمی نظام رائج ہے لیکن اس کے مضر پہلو سے اکثریت غافل ہے اور اس کو ناپسند کرنے والوں کو ''قدامت پسند، دقیانوسی، رجعت پسند اور ملا'' کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

"مغربی تہذیب کی لعنتوں میں سے ایک لعنت ہے جس سے معیارِ تعلیم تباہ ہو رہا ہے، وہ ہے مخلوط تعلیم۔ مخلوط تعلیم کا تصور ایک معاندانہ تصور ہے جسے کسی صورت قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مخلوط تعلیم کا یہ نظام بیسویں صدی کے آغاز میں سکاٹ لینڈ میں شروع ہوا، بعد میں انگلستان کے کئی ایک سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں نے اس سسٹم کو اختیار کر لیا۔ تحریکِ نسواں کے کارکنوں نے ۱۹۵۰ء سے مخلوط تعلیم کے توسیعی تصور کو آگے بڑھانا شروع کر دیا تاکہ نہ صرف مرد و زن کام کی جگہوں پر ران سے ران ملا کر بیٹھیں بلکہ سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے جبڑے آپس میں ٹکرائیں۔ فی زمانہ اسلامی دنیا میں بہت سی این جی اوز نے یہ ذمہ داری اٹھائی ہے جو مغربی فنڈنگ سے مخلوط تعلیم کو بڑھاوا دینے میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف مغرب میں مخلوط تعلیم کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر کئی ایک دانش وروں نے سنگل سیکس ایجوکیشن کے حق میں راہ ہموار کرنا شروع کر دی ہے۔" ۳

یہ درست ہے کہ کسی بھی قوم کو مجموعی طور پر دین سے روشناس کرانے، تہذیب و ثقافت سے بہرہ ور کرنے اور خصائل فاضلہ و شمائلِ جمیلہ سے مزین کرنے میں اس قوم کی خواتین کا اہم، بلکہ مرکزی اور اساسی کردار ہوتا ہے اور قوم کے نونہالوں کی صحیح اٹھان اور صالح نشوونما میں ان کی ماؤں کا اہم رول ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ماں کی گود بچے کا اولین مدرسہ ہے۔ اس لیے شروع ہی سے اسلام نے جس طرح مردوں کے لیے تعلیم کی تمام تر راہیں کشادہ رکھی ہیں ان کو ہر قسم کے مفید علم کے حصول کی نہ صرف آزادی دی ہے، بلکہ اس پر ان کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ جس کے نتیجے میں قرنِ اول سے لے کر آج تک ایک سے بڑھ کر ایک صاحبِ علم و فن اور اہلِ فکر و تحقیق پیدا ہوتے رہے اور زمانہ ان کے علومِ بے پناہ کی ضیا پاشیوں سے مستنیر و مستفیض ہوتا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام نے خواتین کو بھی تمدنی، معاشرتی اور ملکی حقوق عطا کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی حقوق بھی تفویض کیے ہیں، چناں چہ ہر دور میں مردوں کے شانہ بہ شانہ دخترانِ اسلام میں ایسی باکمال خواتین بھی جنم لیتی رہیں، جنھوں نے اطاعت گزار بیٹی، وفاشعار بیوی اور سراپا شفقت بہن کا کردار نبھانے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اپنے علم و فضل کا ڈنکا بجایا اور ان کے دم سے تحقیق و تدقیق کے لاتعداد خرمن آباد ہوئے۔ لیکن اسلام بے پردگی اور مخلوط نظامِ تعلیم کی ہرگز حوصلہ افزائی نہیں کرتا، جب لڑکے اور لڑکیاں دونوں ایک ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہوں، پھر دونوں کی نشست گاہیں بھی ایک ساتھ ہوں، ذوقِ دید اور شوقِ نظارہ بھی موجود ہو اور حسنِ بے پردہ پوری تابانیوں کے ساتھ دعوتِ نظارہ دے رہا ہو، تو بہت سے غیر اخلاقی مسائل جنم لینے کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں تعلیم کی اہمیت اور بالخصوص خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو بخوبی سمجھا جا رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مخلوط طرزِ تعلیم کے مضر اثرات معاشرے پر واضح دکھائی دیتے ہیں۔ مخلوط طرز تعلیم کو ناپسند کرنے کے باوجود ہمارے معاشرے کی اکثریت نے اسے قبول کر لیا ہے حالانکہ مغربی معاشرے جس اخلاقی زوال کا شکار ہیں اس کی بڑی وجہ مخلوط تعلیم ہی ہے اور اب ہمارا معاشرہ بھی اسی اخلاقی پستی کا شکار بنتا جا رہا ہے۔ جو لوگ اس طرزِ تعلیم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، انھیں دقیانوسی قرار دے دیا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہی ہے کہ یہ مغربی طرز تعلیم ماسوائے معاشرتی زوال کے کچھ نہیں۔

آج ہمارے نوجوان ایسے ہی مظاہر اور مخلوط طرزِ تعلیم کی وجہ سے ایسے معاملات اور الجھنوں کا شکار ہیں جو اُن کے بہتر مستقبل کے لیے مسلسل خطرے کا باعث ہیں۔ نوجوانی کے اس دور میں طلبا و طالبات ذہنی ناپختگی کا شکار ہوتے ہیں اور اب جب کہ انٹرنیٹ، موبائل جیسی ٹیکنالوجی مثبت اثرات کے ساتھ ساتھ منفی اثرات بھی مرتب کر چکی ہے اس سے ذہنی ناپختگی اور ہیجان میں اضافہ ہوا ہے، ایسے میں مخلوط تعلیم طلبا اور طالبات کو غلط راہ پر چلنے میں آسانیاں فراہم ہوئیں اور تعلیمی مقاصد اور اس کے فوائد پیچھے رہ جانے سے معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہو رہا ہے۔

ازدواجی زندگی کے مسائل

تعلیمی پسماندگی کے باعث ازدواجی زندگی میں جہاں بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں، وہیں اس پہلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی تعلیم جس میں مغربی تہذیب و معاشرت اور روشن خیالی کے نام نہاد تصورات موجود ہوں، وہاں بھی ازدواجی مسائل جنم لیتے رہتے ہیں اور یہ محض عدم تربیت کے نتیجے کے طور پر دیکھے گئے ہیں۔ ان میں کچھ تو والدین اور زیادہ تر اساتذہ کے طرزِ تعلیم اور عدم تربیت ہی کا نتیجہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اساتذہ نے جہاں تعلیم کیساتھ اخلاقی تربیت سے کوتاہی برتی اور ان کا صرف تعلیمی نکات ہی پر زور رہا، وہاں طلبا اگر اعلیٰ تعلیمی درجات بھی حاصل کر گئے تو ان میں ازدواجی زندگی کی سطح پر ایک گھمنڈ اور اپنے اعلیٰ ہونے کا احساس بھی جنم لینے لگا۔ دوسرا بڑا مسئلہ مرد و زن کے درمیان تعلیمی معیار کے بُعد کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ شوہر کی تعلیم اگر زیادہ ہے اور اسے والدین کی مرضی سے کم تعلیم یافتہ بیوی مل جاتی ہے تو اس میں ایک احساس برتری (Complex of Superiority) پیدا ہو جاتا ہے جو دراصل ماہرین نفسیات کے نزدیک احساسِ کمتری ہی کی ایک شکل ہے۔ اس سے بھی خانگی جھگڑوں کا آغاز ہوتا ہے اور بعض اوقات نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج لڑکیاں لڑکوں کی نسبت زیادہ تعلیم حاصل کرنے پر مائل ہیں تاکہ وہ اپنی پُرامن خانگی زندگی گزار سکیں اور اگر کسی وجہ سے نوبت کبھی طلاق تک پہنچے تو کم از کم وہ اپنی خود کفیل زندگی تو گزار سکیں۔ مگر بعض اوقات یہاں بھی وہی مسئلہ درپیش آجاتا ہے کہ فطرتاً بعض مرد اپنی بیوی کی خود سے زیادہ تعلیم پر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی بہانے بیوی کو زدوکوب کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ امر انتہائی غیر اخلاقی اور بد عملی کی شکل اختیار کر جاتا ہے جس کے نتیجے میں ہماری عائلی زندگی میں شوہر اور بیوی کے والدین بھی بری طرح متاثر ہوتے ہیں اور ان کا بڑھاپا دوگونہ عذاب بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ مسائل پاکستانی معاشرے کے عام مسائل ہیں جن سے نبرد آزما ہوتے ہوتے انسانوں کی قیمتی زندگیاں رائیگاں گزر جاتی ہیں۔

تاہم یہ وہ مسائل ہیں جو نجی اور ازدواجی زندگی گزارنے میں تعلیم کا واضح مقصد پیش نہیں کرتے البتہ ذہنی پسماندگی سے جنم لینے والے رویّے ازدواجی زندگی میں انتہائی درجہ پر ہیں اور بیشتر طلاقیں اسی ذہنی اور تعلیمی پسماندگی کے باعث ہوتی ہیں۔ معاشرے میں فرد کے اخلاق و کردار میں جہالت بدیہی امر ہے۔ تعلیم انسان کو بہتر زندگی گزارنے کا سبق دیتی ہے مگر تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے نتائج ہمارے معاشرے کے کمتر اور اعلیٰ درجات میں بھی موجود ہیں۔ نکاح، جو انسان کی زندگی کے انتہائی اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، خانگی مسائل سے محض جہالت کی بنیاد پر طلاق پر منتج ہو کر رہ جاتا ہے اور اخبارات میں میں کچھ اس قسم کی خبریں گردش کرنے لگتی ہیں:

- دوسری شادی کی اجازت نہ دینے پر بیوی کو گولی مار دی۔ (جنگ، ۱۱ نومبر ۱۹۹۷ء)
- دوسری شادی کرنے پر ماں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ (نوائے وقت، ۱۱ اگست ۱۹۹۷ء)
- شادی شدہ عورت نے اپنے آشنا سے مل کر خاوند کو قتل کر دیا۔ (نوائے وقت، ۱۸ اگست ۱۹۹۷ء)
- لو میرج میں ناکامی پر دل برداشتہ جوڑے نے اپنے اپنے گھر میں زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ (نوائے وقت، ۱۱ اگست ۱۹۹۷ء)
- بیوی عدالت سے خلع لینا چاہتی تھی، شوہر نے بیوی پر تیزاب پھینک دیا۔ حالت بگڑنے پر بدکاری کا مقدمہ درج کروا دیا۔ (نوائے وقت، ۱۴ جولائی ۱۹۹۷ء)
- بہن کو طلاق ملنے پر تین بھائیوں نے بہنوئی کے باپ کو قتل کر دیا۔ (نوائے وقت ۲۹ جولائی ۱۹۹۷ء)

یہ چیدہ چیدہ واقعات جہالت اور ذہنی و تعلیمی پس ماندگی کے چند مظاہر ہیں جو ۱۹۹۷ء (ایک ہی سال) کے اخبارات کی زینت ہیں، جب کہ آئے روز اس قسم کے واقعات تسلسل سے پیش آتے رہتے ہیں۔ بعض جذباتی فیصلے بھی میاں بیوی کے باہمی تعلق پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند اور صاحبِ فہم انسان صرف جذبات سے کام نہیں لیتا بلکہ حالات و واقعات کے تجزیے کے بعد اپنی رائے یا اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر آغا افتخار حسین:

"ایک صحت مند انسان کے لیے جذبات اور عقل دونوں کا صحیح امتزاج ضروری ہے۔ یعنی اس کے جذباتی افعال اور عقلی افعال میں ایک تناسب کی ضرورت ہے۔ اگر جذباتی افعال ضرورت سے زیادہ ہوں تو زندگی کا توازن بگڑ جائے گا۔ اگر عقلی افعال اعتدال سے زیادہ ہوں اور انسان جذبات سے عاری ہو جائے تو اس کے نتیجے میں بھی انسان ایک مشین ہو کر رہ جائے گا اور صحت مند زندگی کا توازن برقرار نہیں رہے گا۔" (۴)

ازدواجی مسائل میں ایک بہت بڑا مسئلہ مرد و زن کے درمیان جنسی عدم صلاحیت بھی ہے۔ میاں بیوی کے باہمی تعلق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو انسانی زندگی کا ایک اہم تر پہلو جنسی تعلق ہے جو بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ تعلق قائم نہ ہو سکے، یا اس میں کمی واقع ہو جائے، تو ازدواجی تعلقات میں بہت سے مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان اس تعلق کی عدم صلاحیت سے خاندانوں میں جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، ان سے اہلِ خاندان واقف نہیں ہوتے کیوں کہ یہ معاملہ میاں اور بیوی کے صیغۂ راز کی حیثیت رکھتا ہے۔ شادی کی ایک مدت گزرنے کے بعد جب میاں بیوی اولاد جیسی نعمت سے محروم رہتے ہیں تو سسرال اور ارد گرد کے رشتے دار زیادہ تر بیوی کو بانجھ قرار دے دیتے ہیں (اگرچہ بعض صورتوں میں یہ بانجھ پن کی صورتیں بھی موجود ہوتی ہیں) مگر حقیقتاً شوہر کی جنسی عدم صلاحیت اس کی بنیاد ہوتی ہے جسے نہ تو شوہر ظاہر کر سکتا

ہے اور نہ ہی بیوی، جس سے دونوں میں ہمیشہ کے لیے علیحدگی ہو جاتی ہے، جب کہ تعلیمی قابلیت کے افراد حقیقت کو سمجھتے ہوئے محض اس وجہ سے جبر و زیادتی کے عمل سے نہیں گزر تیا ور ایسے معاملات کو افہام و تفہیم سے حل کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

جنسی مسائل

ایک عرصے تک ہمارے ہاں جنسی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وجہ سے پاکستانی معاشرے میں اس مظہر سے پیدا ہونے والے اسباب اور نقصانات بہت پیچیدہ اور خطرناک حد تک موجود ہیں، تاہم جنسی مسائل کا ادراک اس وقت زیادہ ممکن ہوتا ہے جب انسان شعور کی منزل کو پہنچتا ہے۔ یہ نوجوانی میں ممکن نہیں ہوتا کہ نوجوانی کے ایام عقل و تدبر کے بجائے جذبات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی نفسیاتی توجیہ میں مختلف مکاتبِ فکر نے اپنے اپنے دلائل سے جنسی پیچیدگیوں کو حل کرنے کوشش کی ہے،

فرائڈ کے نزدیک انسان کی جنسی خواہشات اگرچہ اس کے فطری تقاضوں کی پاس داری کرتی ہیں تاہم مذہبی نقطۂ نظر سے انسان کی جنسی زندگی متوازن طرزِ زندگی کی متقاضی ہے اور اپنے جبلی تقاضوں میں حیوانی طرزِ عمل سے یکسر جدا ہے۔ انسان اور حیوان میں زبان اور شعور کے فرق کے ساتھ ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ افضل المخلوقات ہے اور اس کی یہ فضیلت اس کے تہذیبی دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے قائم رہ سکتی ہے۔ اور اسے ایک ضابطہ اخلاق کا پابند بناتی ہے، جب کہ عام معاشروں، خصوصاً یورپ نے آزادانہ طرزِ زندگی کو اپنا کر مرد و زن میں جنسی ناہمواری کو جنم دیا۔ چناں چہ ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو جب اٹھارویں صدی کے آخر میں یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوا، بڑی تیز رفتاری سے کارخانے اور فیکٹریاں بننی شروع ہو گئیں۔ ان فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لیے جب مردوں کی تعداد کم پڑ گئی تو مزید ہاتھ مہیا کرنے کے لیے سرمایہ دار طبقے نے عورت کو چار دیواری سے نکال کر صنعتی ترقی کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے لیے ''مساواتِ مرد و زن، آزادی نسواں اور حقوقِ نسواں جیسے خوبصورت نعرے اور فلسفے تراشے گئے۔ عورتیں مساواتِ مرد و زن کے دل فریب جال کو ہی اپنی بلندیِ درجات خیال کرتے ہوئے مردوں کے دوش بدوش میدانِ معیشت میں کود پڑیں جس کا اصل فائدہ تو سرمایہ دار ہی کو ہوا لیکن اس کا ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ پہلے جہاں صرف ایک مرد کی کمائی سے گھر کے چار یا پانچ افراد کو محض وسائلِ زندگی مہیا ہوتے تھے، وہاں اسی گھر کے دو یا تین افراد کے برسرِ روزگار ہونے سے ان وسائل کی دوڑ کا آغاز ہو گیا اور یوں مردوں، عورتوں کا فیکٹریوں اور کارخانوں میں شب و روز مشینوں کی طرح کام کرنا ہی مقصدِ حیات ٹھہرا۔ یہ دائرہ کار صرف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ آہستہ آہستہ ہوٹلوں، ریستورانوں، کلبوں، ناچ گھروں، مارکیٹوں، بازاروں سے لے کر سیاست کے اکھاڑوں، سیر گاہوں، کھیل کے میدانوں تک وسعت اختیار کرتا چلا گیا جس سے پوری یورپی سوسائٹیوں میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے شرم و حیا کی اقدار کو ایک ایک کر کے پامال کر دیا۔

مردوں کے دوش بہ دوش چلنے والی عورت میں آرائشِ حسن، نمائشِ جسم، جلوہ نمائی، دل ربائی اور جاذبِ نظر بننے کا جذبہ بڑھنے لگا۔ تنگ بھڑکیلے اور نیم عریاں لباس، بنائو سنگھار، مردوں کے ساتھ نیم عریاں حالت میں سوئمنگ کرنا، عریاں تصویریں اتروانا، کلبوں، ناچ گھروں اور فلموں میں عریاں کردار ادا کرنا پوری یورپی سوسائٹی کا جزوِ حیات بن گیا۔ یہ سلسلہ مختلف ممالک میں پھیلتا ہوا مغرب سے ایشیائی ملکوں میں بھی نزول کرتا چلا گیا۔ برصغیر کے برطانوی عہدِ حکومت میں یورپی تہذیب کے اس مظہر نے جدت پسندی کے نام پر ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوئوں دونوں کو متاثر کیا۔ انگریزوں کے لیے یورپی کلب تو پہلے ہی قائم تھے، دیکھا دیکھی جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی اس کا حصہ بنتے چلے گئے، مگر بیسویں صدی کے نصف اول تک اس کے اثرات بہت کم نظر آتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد، لاہور اور کراچی کے بعض مقامات پر ایسے کلب جو برطانوی عہدِ حکومت کی باقیات میں سے تھے، ان میں بھی یہ سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا اور جمہوریہ اسلامیہ پاکستان جو مسلمانوں کے لیے وجود میں آیا تھا، اس کی آگے پیچھے آتی جاتی حکومتوں کے عہد میں بھی ایک زمانے تک کوئی پابندی نہ لگ سکی۔ آزاد خیال اور منچلے نوجوان ان کلبوں میں جاتے تو ناچ گانا اور نیم برہنہ لباس میں ناچتی گاتی عورت ان کی توجہ کا مرکز رہتی، مگر معاشرے کی عام سطح پر انھیں عورتوں کے ساتھ باہمی اختلاط کی چوں کہ کوئی سہولت نہ ملتی، یا تو وہ اپنی جنسی تسکین کے لیے ان منڈیوں کا رخ کرتے جہاں چند سکّوں کے عوض انھیں سب کچھ میسر آجاتا، یا وہ خود ہی کسمپرسی کی حالت میں بعض جنسی مسائل کا شکار ہو جاتے۔ اس سے جنسی سطح پر بہت سی خطرناک بیماریاں پیدا ہونے لگیں۔

خصوصاً غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو ایک دور تک پاکستانی معاشرے کی اکثریت پر مشتمل تھا۔ ایسے ہی جنسی مسائل سے دوچار ہوا۔ چوری چھپے، جہاں کہیں آنکھ لڑی، کہیں جبراً اور کہیں باہمی سمجھوتے کے ساتھ زنا بالمحرمات کا شکار ہوتا چلا گیا۔ لڑکیوں کے اغوا کی داستانیں تو آئے روز اخبارات میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جاہل اور پسماندہ معاشرے کا فرد ایسے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ کسی اخلاقی تعلیم اور کسی مذہبی جواز کی سند حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتا بلکہ وہ ایسی تعلیمات سے یکسر غافل ہوتا ہے اور اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل میں ہر قسم کے غیر اخلاقی اور مجرمانہ افعال کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔

عورتوں کا استحصال

پاکستانی معاشرے میں عورتوں کا استحصال سماجی اور خانگی سطح پر بھی ایک بہت بڑا المیّہ ہے۔ اس استحصال کی متعدد صورتیں ہیں۔ معاشی جدوجہد کی دوڑ میں شامل خواتین کی تعداد میں اضافے کے باوجود رویوں کی تبدیلی میں ابھی بہت وقت درکار ہے۔ معاشرتی رویے ان کی راہ ہموار کرنے کے بجائے ان کے لیے مشکلات کھڑی کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع اور بیرون ملک سکالرشپ کے معاملے میں بھی خواتین کے لیے دستیاب وسائل ناکافی ہیں۔ لیکن ان تمام چیلنجز سے نمٹتے ہوئے جب ایک خاتون اپنا کیریئر بناتی ہے تو بھی اس کی مشکلات میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ ایک ہی جیسی ذمہ داریاں اور ایک ہی جیسی کارکردگی دکھانے کے باوجود مردوں اور خواتین کی اجرتوں میں واضح فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کی کارکردگی کو متاثر کرنے کے لیے جنسی طور پر ہراساں کرنے کا ہتھیار تک استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

عورتوں کا مالی استحصال صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہوتا بلکہ پوری دنیا میں ان کا یہی حال ہے۔ ہر تیسرے گھر میں خانگی اخراجات عورتیں چلاتی ہیں اور غذائی اجناس کے پیدا کرنے میں ان کا قابل لحاظ حصہ ہے۔ یہی کھانا بناتی اور کھلاتی بھی ہیں اور اکثر عورتیں سب سے اخیر میں اور سب سے کم کھاتی ہیں۔ وہ پہلے اپنے شوہر اور بچوں کو کھلاتی ہیں اور آخر میں جو بچ جاتا ہے وہ خود کھاتی ہیں۔ عورتیں مردوں کے زیر تسلط معاشرے میں ہر طرح سے نظرانداز کی جاتی ہیں۔ بے شمار خواتین اپنوں یا غیروں کی طرف سے جنسی وجسمانی تشدد کا شکار ہوتی ہے اور کئی اپنے قریبی متعلقین کے ذریعہ قتل یا تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ سسرال والوں کی طرف سے عورتوں پر ظلم وجبر بھی ایک تلخ حقیقت ہے بلکہ پاکستانی اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی آگے ہیں۔ گزشتہ دہائیوں کے مقابلے میں رواں سالوں میں ان میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ گھریلو تشدد کی وجہ سے ملک میں یومیہ کئی خواتین خود کشی کر لیتی ہیں۔ پوری دنیا میں گھریلو تشدد کے جتنے واقعات رپورٹ ہوتے ہیں ان میں ایک تہائی تعداد امریکہ اور برطانیہ کی ہوتی ہے۔ ۲۰۰۲ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق امریکہ میں ہر سال تیرہ لاکھ عورتیں اپنے رفقاء (شوہر یا پارٹنر) کے ذریعہ جسمانی تشدد اور ایذارسانی کا شکار ہوتی ہیں۔

اسلامی تعلیمات کے آئینے میں، عورتوں کے استحصال کے نمایاں مظاہر یہ ہیں:

۱۔ بہت سے گھروں میں بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ عدم سلوک کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ بیٹیوں کو نظرانداز کر کے بیٹوں کے ساتھ خوراک وطعام میں خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی استحصال نسواں کا ایک مظہر ہے جو والدین کی جانب سے لاشعوری انداز میں روا رہتا ہے۔

۲۔ وراثت میں حلق تلفی کا معاملہ تو ہمارے ہاں عام دیکھنے کو ملتا ہے۔ قرآن حکیم میں بیٹوں کے حق کے لیے خصوصی تلقین کی گئی ہے مگر والدین جہالت کی بنیاد پر انھیں اس حق سے محروم رکھتے ہیں۔

۳۔ اسلام میں جہاں ولی کے بغیر عورتوں کی شادی نہیں ہوسکتی وہیں عورت کا شادی کے لیے اس کی مرضی کے مطابق رضامند ہونا بھی ضروری ہے جب کہ ہمارے ہاں اکثر شادیاں بیٹیوں کی مرضی کے بغیر کر دی جاتی ہیں۔

۴۔ ہمارے معاشرے میں عورتوں کا جنسی استحصال بھی کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں زناکاروں نے لیے سو کوڑوں کی حد مقرر کی ہیجب کہ حدیث میں شادی شدہ زناکار مرد اور عورت کے لیے سنگ ساری کی سزا مقرر کی ہے۔

۵۔ پاک دامن عورتوں پر جھوٹے الزامات لگانے کی روش بھی عام ہے۔ حالانکہ پاک دامن عورتوں پر تہمت کی سزا کے طور پر اسّی کوڑے لگانے کا حکم ہے۔

۶۔ بعض لوگ اپنی بہن، بیٹی، بیوی کو غیرت کے نام پر قتل کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف عام تعلیم بلکہ اسلامی تعلیمات سے ناآشنا ہیں۔ میں بیان کیا گیا ہے کہ ''اور وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں اپنی بیویوں پر، اور نہ ہوں ان کے لیے (اس پر) گواہ مگر ان کے نفس (یعنی وہ خود ہی) تو گواہی اُن میں سے (ہر) ایک اللہ کی قسم کے ساتھ چار گواہیاں ہیں کہ بلاشبہ وہ یقیناً سچوں میں سے ہیاور پانچویں (بار یہ کہے) کہ بے شک اللہ کی لعنت ہو اس پر اگر وہ جھوٹوں میں، اور ٹال دے گی اس (عورت) سے سزا کو (یہ بات) کہ وہ گواہی دے، چار گواہیاں اللہ کی قسم کے ساتھ (کہ) بلاشبہ یقیناً وہ جھوٹوں میں سے ہے، اور پانچویں بار (عورت یوں کہے) کہ بے شک اللہ کا غضب (نازل) ہو اس (عورت) پر اگر (ہو) مرد سچوں میں سے۔'' سورۃ النور کی آیت ۶ تا ۹

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں غیرت کے نام پر قتل کرنا ناجائز ہے اور سخت کبیرہ گناہ ہے۔

عورتوں کے حقوق سلب کرنے اور سماجی وانفرادی استحصال کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تعلیمی شعور کے لیے خصوصی اقدامات نہ کیے جائیں اور مجموعی معاشرے کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ نہ کر دیا جائے۔

مردوں کی اجارہ داری

مردوں کی اجارہ داری بھی عورتوں کے استحصال ہی کی نمایاں شکل ہے۔ اگرچہ قرآن حکم کی رُو سے مرد کو عورت پر فائز رکھا گیا ہے اور مرد ہی کو عورت کے نان ونفقہ اور دیگر ضروریات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ مگر جس تیزی سے سماج کو مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش ہو رہی ہے، اس کے نتائج بھی سراسر منفی ہیں۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اس کے لیے دلیل کے طور پر پورے مغرب کو خاص طور پر ان کے نمائندہ امریکہ کو پیش کیا جاسکتا ہے جہاں خواتین کے خلاف جرائم ناقابل تصور ہیں اور جہاں خواتین اپنی آزادی اور مساوات کی معراج سے بہرہ ور ہیں مگر وہاں بھی بعض امور میں مردوں ہی کی اجارہ داری نظر آتی ہے۔ میڈیا، جس کی باگ ڈور مغربی دنیا یا ان کے فکری غلاموں کے ہاتھ میں ہے، اس کا مبلغ ہی نہیں خود استحصالِ نسواں کا مضبوط آلہ کار ہے۔ الیکٹرانک میڈیا جس کی سب سے مقبول شکل ٹی وی ہے عریانیت، فحاشی اور جنسی انار کی ایک طرف تو تبلیغ کر رہا ہے دوسری طرف ایک ایسا پلیٹ فارم بن گیا ہے جہاں خواتین کا جنسی وجسمانی استحصال ہوتا ہے۔

مغربی ممالک میں بنیادی حقوق، انسانی حقوق، مساوی حقوق، حقوق نسواں اور آزادی نسواں کا خوب غلغلہ بلند ہوا اور بعض پہلوؤں سے عورتوں کو مغربی ممالک میں حقوق مل بھی گئے لیکن اس کے باوجود عورتوں کی مظلومیت ختم نہیں ہو سکی۔ تحریک آزادی نسواں کی وجہ سے خواتین جب مردوں کے برابر کھڑی ہوئیں تو دونوں کی رفیقانہ حیثیت بری طرح متاثر ہوئی اور اب وہ دونوں حریفانہ جذبات میں مبتلا ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ مردوں کو فطری طور پر تمام انسانی سماجوں میں تفوق اور تسلط حاصل ہے۔ چناں چہ مغربی دنیا میں بھی مردوں نے عورتوں کی برابری کو دل سے قبول نہیں کیا اور مختلف پہلوؤں سے عورتوں کو ذہنی، جسمانی اور معاشرتی طور پر زدوکوب اور تشدد کا نشانہ بنانے لگے۔

اگر ہم اس اجارہ داری کے حوالے سے دوسرے پہلو بھی غور کریں تو عورتوں کا ایک طبقہ وہ ہے جو آزادیِ نسواں کی ساری حدوں کو پار کرنا چاہتا ہے۔ حقوق کا تو انھیں علم ہوتا ہے مگر اپنے صنفی فرائض کے معاملے میں وہ ایسے لاعلم ہو جاتی ہیں جیسے انھوں نے اس بارے کبھی کچھ سنا ہی نہ ہو۔ یہ مغرب زدہ دوہرے رویے کی حامل عورتیں کسی غیر محرم مرد کے ساتھ بازاروں، ہوٹلوں اور پارکوں میں مردوں کے ساتھ برابری کے حقوق کا تقاضا رکھتے ہوئیجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ''میرا جسم میری مرضی'' جیسے نعرے بھی بلند ہوئے۔

تاہم ہمارا پاکستانی معاشرہ، اگرچہ عورت کی عزت وناموس کا قدردان بھی ہے، لیکن اسی معاشرے کے ناپسندیدہ افراد، اور ایسے افراد، جو عورت کی عزت وناموس کے رکھوالے ہیں، کسی نہ کسی انداز میں اپنی طبعی مجبوری کے تحت عورت پر اپنی اجارہ داری قائم رکھتے ہیں اور اسی اجارہ داری کے نتیجے میں کہیں کہیں عورت کو آزادی نسواں کی تحریک کے تاریک پہلو بھی روشن محسوس ہونے لگتے ہیں۔ تاہم شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے اس نقطۂ نظر سے انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے:

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ جانا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

جاگیر دارانہ نظام

جاگیر دارانہ نظام بہت قدیم معاشی نظام ہے۔ اس نظام کا آغاز یورپ میں فیوڈل ازم کے نام سے نویں صدی میں ہوا اور رفتہ رفتہ یہ اپنا ارتقائی سفر طے کرتا ہوا ایک نئی تہذیب، نئے رنگ اور نئی اقدار کو جنم دیتا گیا اور تیرھویں صدی تک اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغربی لوگوں نے فیوڈل ازم سے بیزاری کا اظہار شروع کر دیا اور آخر مختلف انقلابات کے نتیجہ میں اٹھارھویں صدی کے وسط تک یہ نظام زوال پذیر ہو گیا۔ یورپ میں جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے ساتھ شعور وآگہی نے ایک نئی کروٹ لی۔ طبیعات، ریاضی، انجینئرنگ اور دوسرے شعبوں میں اہلِ مغرب کا علم بڑھنا شروع ہوا۔ نئی جغرافیاتی دریافتوں سے فکر ونظر میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل مغرب کے لیے دور دراز کے ممالک میں تجارتی منڈیاں بھی کھلنا شروع ہو گئیں۔ چناں چہ اس پرانے جاگیر دارانہ نظام کی جگہ ایک نئے نظام کی ابتدا ہوئی جو سرمایہ دارانہ نظام کہلایا۔ اس نظام کی بنیاد جغرافیائی راستوں کی تلاش، تجارتی اجارہ داری، غلاموں کی خرید وفروخت اور سمندری لوٹ مار پر تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جب ہندوستان میں تجارتی غرض سے آئی تو اسے ابتداء میں اپنے قدم جمانے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ ڈچ اور پرتگیزی پہلے ہی سے وہاں موجود تھے اور ساحلی علاقوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر چکے تھے۔ انگریز ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک نہایت صبر سے انتظار کرتے رہے اور آخر ان کی قسمت کا پانسہ پلٹنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ ملک کے حاکم بن گئے یہ انسانی تاریخ کا اعجوبۂ روزگار واقعہ ہے۔ تجارتی سرمایہ داری کے بعد جب صنعتی سرمایہ داری شروع ہوئی تو معاشرے کی مجموعی صورت یکسر تبدیل ہو گئی۔ صنعتی انقلاب سے مغرب کو ایک اور برتری مل گئی۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی اس نے تیسری دنیا کو اپنا غلام بنا کر نیا کھیل شروع کر دیا۔ برطانیہ کے صنعتی سامراج نے ہندوستان کے ساتھ

ایسا شیطانی کھیل شروع کیا جو استعماری نظاموں کی خصوصیت ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ دار طبقے کی دولت میں تو اضافہ ہوا مگر متوسط اور غریب طبقہ بے روزگاری اور مفلسی کی دلدل میں پھنستا گیا۔ یوں مغربی سرمایہ دارانہ نظام ایک ایسا استحصالی نظام بن گیا جس کا مقصد دوسری قوموں کو غلام بنا کر اپنی معیشت کو مضبوط بنانا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کارل مارکس نے سوشلزم کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے نتیجے میں مزدوروں میں بھی انقلابی رنگ نظر آنے لگا اور سرمایہ داروں کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہو گئی۔ اگرچہ اس نظام کی مخالفت پوری دنیا میں ہوئی مگر یہ نظام مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں یہی معاشی نظام رائج ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی کا پاکستان میں جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس ملک میں جاگیر دارانہ نظام مضبوطی سے جما ہوا ہے مگر سرمایہ دارانہ نظام بھی واضح طور پر موجود ہے، حالانکہ اسلام میں اس معاشی نظام کی کوئی اجازت نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہمارے اسلامی ملک میں یہ نظام آزادی سے پھل پھول رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ایسٹ پبلشرز لمٹیڈ کراچی ۱۹۶۴، ص ۱۸

۲۔ خلیل احمد، ڈاکٹر: پاکستان میں ریاستی اشفاریہ کا عروج، لاہور، اے ایس انسٹیٹیوٹ، ۲۰۱۲ء، ص ۳۶

۳۔ ماہنامہ ''سوئے حرم''، لاہور، مدیر اعلیٰ محمد صدیق بخاری، شمارہ ستمبر ۲۰۱۴ء، مشمولہ مضمون ''مخلوط تعلیم۔ مضمرات، خطرات اور نقصانات، از پروفیسر ملک محمد حسین۔

۴۔ افتخار حسین، آغا: قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۱۷ ۲۲۷